پاکستان میں علمی و ادبی تحقیق کا حال

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی

پاکستان میں علمی و ادبی تحقیق زوال کا شکار ہے۔ اس زوال کا پاکستان کی سیاسی تاریخ سے گہرا تعلق ہے۔ سیاسی نشیب وفراز (فراز سے نشیب کی طرف سفر) اور حکمرانی کا (گوارا یا بہتر معیار سے پست ہوتا ہوا) معیار، زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح علم وتحقیق اور علمی وتحقیقی اداروں پر بھی اثر انداز ہوا ہے۔

قیامِ پاکستان کے اوائل میں نئی یونی ورسٹیوں اور متعدد علمی اداروں کے قیام کی صورت میں بعض خوش آیند اقدام کیے گئے ،جس کے نتائج حوصلہ افزا تھے (اگرچہ یہ بھی حقیقت ہے کہ بعض پہلوؤں سے چند اداروں کی کارکردگی مایوس کن تھی)۔

جس طرح ملک میں جمہوریت صحیح معنوں میں جڑ نہیں پکڑ سکی اور جمہوریت کے پودے کو بار بار نوچ کر، جڑ سے اُکھاڑ پھینکا جاتا رہا، اسی طرح اداروں میں بھی من پسند اور نااہل افراد کا تقرر کیا جاتا رہا، خصوصاً ۱۹۷۲ء کے بعد کے اَدوار میں تو اہلیت اور میرٹ کو ایک طرف ہی نہیں، بالائے طاق رکھ دیا گیا۔ مثال کے طور پر کم و بیش تمام ہی وفاقی تحقیقی وادبیاتی اداروں کے سربراہان کچھ ایسا تعارف رکھتے ہیں کہ جنھیں تحقیق وتفکر سے کم ہی واسطہ ہے۔ اسی طرح بیرون ملک (برطانیہ، جرمنی وغیرہ) پاکستان اور اقبال مسندوں (chairs) پر میرٹ سے ہٹ کر ایسے من پسند افراد کا تقرر کیا جاتا رہا جو اِن مسندوں کے لیے مقررہ ضابطوں اور شرائط ومعیار پر قطعی پورے نہیں اُترتے تھے (یا پھر ایسی متعدد مسانیدِ دانش (chairs) آج تک خالی پڑی ہیں)۔

ایسے سربراہ اور 'عالم' اپنے مربّیوں کی خوش نودی کو مقدم سمجھتے تھے چنانچہ لاہور کے ایک

علمی ادارے کے سربراہ نے حاکمِ وقت کے اشارۂ ابرو پر پہلے تو ملّا پر چاند ماری کی اور کندھا علّامہ اقبال کا استعمال کیا۔ پھر انھیں اقبال کی شاعری میں بھی کیڑے نظر آنے لگے۔ مغربی تہذیب پر اقبال کی تنقید ان کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکنے لگی اور انھوں نے بڑے بھدّے انداز میں اقبال پر بھی تبرّا کیا۔

اقبال کا ذکر ہوا تو سمجھ لینا چاہیے کہ تخیل پاکستان، تشکیل پاکستان اور پھر تعمیر پاکستان میں اقبال کے کلام و پیغام کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ وہ محض ایک شاعر نہیں بلکہ پاکستان کے وجود کو تقویت عطا کرنے کا ایک زندہ و توانا حوالہ بھی ہیں۔ اس لیے آج ۷۰ برس گزرنے کے بعد ہمیں اقبال کے حوالے سے روا رکھے جانے والے طرزِ عمل کا توجہ سے جائزہ لینا چاہیے۔

اقبال کے فکر پر تحقیق اور ان کے پیغام کی نشرواشاعت کے لیے حکومتی سطح پر لاہور میں دو ادارے قائم ہیں: اقبال اکادمی پاکستان وفاقی حکومت کا ادارہ ہے اور بزم اقبال پنجاب کی صوبائی حکومت کا۔ دونوں اداروں نے سیکڑوں کتابیں چھاپی ہیں، مگر فروغِ اقبالیات کے ضمن میں صرف کتابیں چھاپنا ہی کافی نہیں، اقبال کے فکر اور پیغام کی نشرواشاعت کے لیے دوسرے ذرائع اختیار کرنا ناگزیر ہے مگر ایسا کچھ نہیں کیا گیا (البتہ ایک استثنیٰ ہے۔ اقبال اکادمی نے خصوصاً محمد سہیل عمر کے زمانۂ نظامت میں، ابلاغِ فکر اقبال کے لیے کتابوں کی اشاعت کے علاوہ نشرواشاعت کے جدید برقی ذرائع بھی اختیار کیے، جن میں آڈیو کیسٹ، وڈیو کیسٹ، سی ڈی، نمایشیں، اقبالیات کے مختلف النّوع مقابلوں اور مذاکروں کا انعقاد وغیرہ شامل ہیں)۔ تاہم ان اداروں میں بہ حیثیتِ مجموعی تنظیم، ترتیب اور منصوبہ بندی کی خاصی ضرورت ہے۔

یہ منصوبہ بندی کی کمی ہی تھی، جس کی وجہ سے، مثلاً اقبال کے صدسالہ جشنِ ولادت تک علامہ اقبال کی کوئی ڈھنگ کی سوانح عمری نہ لکھی جاسکی تھی۔ پچاس کے عشرے میں بزمِ اقبال نے یہ منصوبہ ابتدا میں غلام رسول مہر کے سپرد کیا، پھر ان سے واپس لے کر عبدالمجید سالک کو دے دیا۔ انھوں نے ۱۹۵۵ء میں ذکر اقبال لکھ دی تو اس پر شدید تنقید ہوئی۔ بعض افراد نے اپنے طور پر سوانح عمریاں لکھیں، مگر اداروں کی سطح پر مزید کوئی کوشش نہ کی گئی۔ اسی لیے ۱۹۷۷ء کی صدسالہ جشن اقبال کمیٹی نے ایک مفصّل اور معیاری سوانح عمری لکھنے کا کام پہلے سید نذیر نیازی، بعدازاں

ڈاکٹرعبدالسلام خورشید کے ذمے لگایا مگر بات نہیں بنی۔ آخر علامہ کے فرزندِ ارجمند جاوید اقبال مرحوم نے زندہ رود لکھ کر اس کمی کو پورا کیا۔

میرا تاثر یہ ہے (اور اکثر حضرات اس سے اتفاق کریں گے) کہ اقبالیات ہو، غالبیات ہو یا تاریخِ ادب یا ادبِ اردو کا کوئی شعبہ، جو چند ایک قابل قدر کام ہوئے، بیش تر وہ انفرادی کاوشوں کا نتیجہ ہیں۔ اداروں کی کارکردگی بالعموم ناقص رہی ہے، حالاں کہ وسائل، بہ نسبت افراد کے، اداروں کو میسر ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر عطاء الرحمٰن ہائرایجوکیشن کمیشن کے سربراہ مقرر ہوئے، تو علمی وادبی تحقیق میں تیزی و تیز رفتاری آئی، مگر معیار، مقدار کا ساتھ نہ دے سکا۔ جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم کے ایما پر پی ایچ ڈی اور ایم فل کے وظائف دینے کے مثبت قدم نے، عملاً معیار کو نیچے کھینچنے میں حصہ لیا ہے اور اب تو جامعات میں تحقیقی مقالے یوں دھڑادھڑ تصنیف ہورہے ہیں، جس طرح کسی فیکٹری سے خاص وضع قطع کے بُرے بھلے پُرزے تھوک کے حساب سے ڈھل ڈھل کر نکلتے چلے آتے ہیں۔ تحقیق کرانے والے اساتذہ کی کمی نہیں مگر محنت کرنے اور کرانے والے اساتذہ بہت کم ہیں۔ آج ایک اخبارنویس نے اپنے بقول 'انکشاف' کیا ہے کہ پاکستانی جامعات میں ۱۱ہزار پی ایچ ڈی اسکالر (اساتذہ) اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں، جب کہ مزید ۳۰ ہزار اسکالروں کی ضرورت ہے۔ ہائرایجوکیشن کمیشن کی کوشش ہے کہ اگلے سال میں مزید ۲۰ ہزار اسکالر تیار کیے جائیں (روزنامہ ۹۲نیوز، ۲۳رجولائی ۲۰۱۷ء)۔ گویا کمیشن مقدار بڑھانے کی فکر میں ہے، حالاں کہ ضرورت ان 'خدمات' کا معیار بڑھانے کی ہے، جو موجودہ ۱۱ ہزار اسکالر انجام دے رہے ہیں۔

بقول رشید حسن خاں: ''ہمارے اساتذہ (اسکالر) کو ترقی کے ہجے کرنے سے فرصت نہیں ہے''۔ چمک نے چندھیادیا ہے۔ تحقیق کا معیار بلند ہو تو کیسے؟ معیار تو بعد کی بات ہے، اب تو پی ایچ ڈی اور ایم فل اسکالر موضوعاتِ تحقیق کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں، کیوں کہ ان کے اساتذہ نے موضوعات کی تلاش بھی شاگردوں کے ذمے ڈال دی ہے (حقیقت یہ ہے کہ موضوعات موجود ہیں، مگر ان پر کام کرانے کے لیے اساتذہ کو خود بھی محنت کرنی پڑتی ہے، دل جمعی سے مطالعہ کرنا پڑتا ہے، اس لیے وہ ان مشکل موضوعات کے قریب نہیں پھٹکتے)۔

پاکستان کا مستقبل تعلیم (تحقیق جس کا لازمی جزو ہے) کے اچھے معیار اور انصاف کی بلا تاخیر فراہمی پر منحصر ہے، اور یہی دو چیزیں ہمیں نظر نہیں آتیں۔ مگر خوش آیند بات یہ ہے کہ پاکستان کی سیاسی تاریخ میں شاید پہلی بار احتساب کا سلسلہ شروع ہوا ہے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ علمی تحقیق خصوصاً جامعات کے تحقیقی مقالوں کا بھی جائزہ لیا جائے (خصوصاً سماجی و ادبیاتی علوم)۔ جامعات کے تحقیقی مقالوں کے پست معیار کا ایک سبب ہائر ایجوکیشن کمیشن کی غفلت بھی ہے۔ وہ کم ہی اس بات کا اہتمام کرتی ہے کہ تحقیقی مقالات کے لیے اس نے جو اصول اور ضابطے مقرر کیے ہیں، یہ دیکھے کہ کیا تحقیقی مقالوں میں ان کی پابندی کی جارہی ہے؟ ماضی قریب میں ہائر ایجوکیشن کمیشن نے ضابطہ جاری کیا تھا کہ مقالہ نگاروں کا زبانی امتحان (viva) کھلے بندوں لیا جائے گا اور مقالہ نگار اپنے مقالے کا کھلا دفاع (open defence) کریں گے۔ شعبوں سے کہا گیا تھا کہ وہ اس کے لیے امتحان کا وقت اور تاریخ میڈیا پر نشر کرانے کا اہتمام کریں، عنوان بھی بتایا جائے اور عوام النّاس کو دعوت دی جائے کہ وہ اس موقعے پر زبانی امتحان کا مشاہدہ کریں اور امیدوار سے سوالات کریں۔ اگر مقالہ نگار، تسلی بخش جواب نہ دے سکے تو اسے تیاری کا ایک اور موقع دے کر دوبارہ امتحان لیا جائے۔ افسوس ہے کہ ہماری جامعات میں اِلّا ماشاء اللہ، اس کا اہتمام نہیں کیا جاتا۔ شعبے اخبارات میں اطلاع نہیں بھیجتے۔ خانہ پُری کے لیے متعلقہ شعبے میں فقط ایک نوٹس لگا دیا جاتا ہے، بسا اوقات اسی روز یا ایک آدھ روز پہلے۔ یہ کمیشن کے ضابطے کا مذاق اُڑانے والی بات ہے مگر کمیشن نے مذاق اُڑانے والوں کا شاید ہی کبھی احتساب کیا ہو۔ اگر کمیشن غفلت نہ برتے اور اس بات کو یقینی بنائے کہ کھلے بندوں دفاع کے ضابطے پر پابندی سے عمل کیا جارہا ہے تو اس سے مقالات کا معیار بہتر ہوگا۔

بہرحال، اُمید رکھنی چاہیے کہ حالات بہتر ہوں گے۔ ہمیں ایک لمبا فاصلہ طے کرنا ہے، تب کہیں جا کر قیام پاکستان کے مقاصد پایۂ تکمیل کو پہنچیں گے۔